ڈاکٹر این اے بلوچ :

قاضی احمد میاں اختر مرحوم اور جوناگڑھ کی یاد میں

گاہے گاہے باز خواں ایں قصّۂ پارسینہ را

۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۱ء جوناگڑھ میں قیام رہا کہ وہاں پر بہاء الدین کالج میں بی - اے کی ڈگری کے لیے داخلہ لے رکھا تھا۔ سندھ کے خشک میدانی ماحول کے برعکس جوناگڑھ کا خطہ سرسبز و آباد تھا ، اور شہر تو پہاڑوں کی آغوش میں بسا ہوا تھا جس کو دیکھتے ہی تعجب اور تحیر کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ اس وقت ریاست کے نواب جناب مہابت خان جی تھے۔ برسوں پہلے ، ریاست کے روشن دماغ وزیر با تدبیر جناب بہاء الدین کی مساعیِ جمیلہ سے ڈگری کالج قائم ہوا تھا جس میں طلبہ کے لیے ٹیوشن فیس معاف تھی - شہر و ریاست کے ہندو اور مسلمان طلبہ اور طالبات کے علاوہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے غریب مسلمان طلبہ وہاں پر پہنچتے تھے - ان کے لیے ہوسٹلوں میں رہنے کا انتظام تھا - کالج کی فضا پرامن و پرلطف تھی اور تعلیم پر پوری توجہ دی جاتی تھی - پہلے سال کے نصف میں مقابلے کا ایک امتحان ہوا کرتا تھا جس میں اوّلیت حاصل کرنے والے کو آٹھ روپے فی ماہ وظیفہ ملتا تھا - راقم نے جب یہ وظیفہ حاصل کر لیا تو سارے مسائل حل ہو گئے - کھانے کے انتظام کے لیے ہوسٹلوں میں کلب تھے جو طلبہ خود چلاتے تھے۔ میں نے جب دیکھا کہ دھاندلی ہو رہی ہے اور فی ماہ بل اٹھارہ روپے تک جا پہنچا ہے تو مروجہ سررشتے سے قطع تعلق کرکے ایک جداگانہ کلب قائم کر لیا، تاکہ حتیٰ المقدور کم خرچ پر اچھا کھانا مہیا ہو سکے - اس مقصد میں کامیابی ہوئی اور فی ماہ بل گیارہ روپے تک جا پہنچا - کلب کے ممبروں کے لیے لازمی تھا کہ ہر ہفتۂ مہینے کی یکم کو وہ ماہانہ بل کی رقم پیشگی ادا کریں - ہم نقد رقم دے کر ، کھانے پینے کی اشیاء کافی رعایت سے خرید کر لیتے تھے - شہر کے مرکزی " دیوان چوک " کی بڑی دکانوں سے سودا لیتے - بہترین چاول اٹھارہ روپے فی من ، خالص گھی ایک روپے کا ایک سیر تا سوا سیر، دار جیلنگ چائے (سچانگ پیکو ، لیبل والی) نو روپے فی پاؤنڈ وزن کا ڈبہ، ہر جمعے کو بریانی اور میٹھے کا حلوا پکتا تھا - بس عیش ہی عیش تھے۔

پہلا ایک ڈیڑھ سال تو زیادہ تر نئے ماحول اور نئی فضا سے مانوس ہونے میں لگا۔ شہر کے گرد شہر پناہ کے طور پر پتھر کی مضبوط دیوار اور شہر کے اندر وسط میں قدیم قلعہ " اوپر کوٹ " - یہی جھونا (قدیم) گڑھ تھا جس پر شہر کا نام پڑا۔

شہر کے جنوب کو واقع اپنے ہوسٹل سے جب ہم شہر کو جاتے تھے تو " کالوا " گیٹ سے داخل ہوتے تھے اس دروازے کا نام " کالوا " ندی (برساتی نالہ) کے نام پر تھا - نماز جمعہ کے لیے شہر کے اندر جامع مسجد میں جاتے تھے - شہر کے مشرق کی طرف اونچے پہاڑ تھے - جن کی وجہ سے ہماری ہوسٹلیں اور شہر کا مشرقی حصہ ، صبح کے سات آٹھ بجے تک سایے میں ڈھکے رہتے تھے - جون تا ستمبر موسلا دھار بارشیں ہوتی تھیں اور ہم دور سے آبشاروں کو دیکھ کر پہاڑوں پر جا پہنچتے تھے - ربڑ کے برساتی جوتے بارہ آنے (آج کے پچھتر پیسے) میں ملتے تھے جن سے چار مہینے تک گزارا ہو جاتا تھا۔ ہوسٹلوں سے سیدھا مشرق کی طرف داتار پہاڑ تھا جس کے اوپر جمیل شاہ داتار ٹھٹوی کی چلہ گاہ تھی - مجاور سندھی بول لیتے تھے - بزرگ جمیل شاہ شہر ٹھٹہ سے بارہ میل جنوب کو " پیر آر " (پیر پٹھا) پر مدفون ہیں جہاں پر جمیل شاہ گرناری کے نام سے مشہور ہیں یہاں سے وہ گرنار پہاڑ پر گئے اور پھر داتار پہاڑ پر چلہ کشی کی - گرنار پہاڑ ، داتار کے شمال کو واقع ہے جس کے اوپر جین دھرم کے مندر پائے جاتے ہیں - گرنار ایک اونچا پہاڑ ہے ، اور جو لوگ وہاں جاتے تھے تو رات کو وہیں پر ٹھہر جاتے تھے - مالدار افراد خود کو ڈولیوں میں اٹھوا کر اوپر پہنچتے تھے - مگر کالج کے طلبہ کا پہاڑی ٹولہ ، پہاڑوں پر چڑھنے اترنے میں اتنا مشاق ہو گیا تھا کہ ہم ایک ہی دن میں گرنار پہاڑ پر چڑھے اور واپس نیچے اترے - شہر جوناگڑھ کے اطراف اور بعض دور دراز علاقوں کو جا کر دیکھتے تھے۔ دھوراجی ، راج کوٹ ، منگرول ، کتیانہ اور مانا وادر شہروں کے علاوہ ساحل سمندر پر ویراوال بندر پر پہنچے - ویراوال سے سومناتھ کو گئے - وہاں پر ایک قدیم قبرستان دیکھا جس میں ایک لمبی قطار ایسی قبروں کی نظر آئی جن پر پتھر میں تراشے ہوئے گھوڑوں کے سر استوار تھے - ان کی نسبت یہ روایت سنی کہ یہ سلطان محمود غزنوی کے لشکر کے گھوڑے تھے جو یہاں پر مرے اور دفن ہوئے - اس طرح کی تگ و دو سے ، پہلے ایک ڈیڑھ سال میں ہی ہم نے جوناگڑھ شہر اور اطراف کے ماحول کو اپنا لیا تھا۔

سنہ ۱۹۳۸ء کے آخر میں جب ذہن علم و فضل کی راہیں تلاش کرنے لگا تو بعض قد آور شخصیتیں نظر آنے لگیں جن میں بالخصوص قاضی احمد میاں اختر صاحب زیادہ نمایاں تھے بعض دوسرے بزرگ جو میری یادوں میں زندہ رہے ہیں وہ یہ تھے : کالج کے پرنسپل جناب ظہور الدین احمد صاحب جو وضع قطع میں سو فی صد مسلمان اور طالب علموں پر مہربان تھے فلسفہ اور نفسیات کے عالم تھے اور ان علوم کے حوالوں سے کتابیں لکھی تھیں جن میں سے ایک دو اس وقت تک چھپ چکی تھیں -

کالج کے اساتذہ میں سے جناب طاہر علی صاحب ہمیں عربی پڑھاتے تھے اور لائق فائق تھے - جناب راؤ صاحب ہندو اساتذہ میں سے ریاضیات کے اچھے استاذ تھے - میں نے انٹر میں منطق کے بجائے ریاضیات بطور اختیاری مضمون لے رکھا تھا- راؤ صاحب کی ذہانت سے متاثر ہو کر میں نے اس مضمون میں خوب محنت کی اور انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے - چنانچہ راؤ صاحب نے ترغیب دی کہ میں ریاضیات میں بی - اے کروں - لیکن ساتھ ہی عربی میں اچھے نمبر آئے اور جناب طاہر علی صاحب کی تلقین نے ان کی طرف کھینچ لیا- پروفیسر اوزا صاحب ہمیں انگریزی پڑھاتے تھے- معمر مگر شگفتہ طبع تھے اور کلاس میں ان کی اور طلبہ کی آپس میں خوب نوک جھونک رہتی تھی جناب ترمذی صاحب ہمیں فارسی پڑھاتے تھے (جو میرا اختیاری مضمون تھا) ان کا طریقہ تدریس محققانہ اور استفسار پر مبنی تھا - چنانچہ مجھے پہلی بار علمی تحقیق و تجسس کی کرنیں نظر آنے لگیں- کالج سے باہر شہر میں جناب برہانی صاحب شہر کے روساء میں سے تھے یا ریاست کے کسی محکمے کے سربراہ - نیلی مسجد (؟) کے پیش امام عربی کے فاضل تھے اور میں فراغت میں ان کے ہاں جا کر ابن درید کا مقصورہ پڑھتا تھا - ریاست کے لانسرس (گھڑسوار فوج کا رسالہ) کی مسجد کے حافظ عالم فاضل تھے ، فرخ آباد کے رہنے والے تھے- رمضان میں تراویح پڑھاتے تھے اور میں اکثر وہیں نماز کے لیے جایا کرتا تھا - شہر کے تجارتی حلقوں میں ہاشم سیٹھ (میمن) ایک معزز شخص تھے اور نواب صاحب کے ہاں مقبول تھے- دیوان چوک میں ان کی دکان تھی اور میں ان کے ہاں جا کر بیٹھتا تھا - فاروقی صاحب کا چھوٹا سا پریس تھا - قلندر صفت انسان تھے - اسلام کی خدمت کا جذبہ رکھتے تھے- قرآن شریف کے گجراتی ترجمے کو شایع کرنے کا اہتمام کر رہے تھے اصل میں جبل پور کی طرف کے رہنے والے تھے- میں ان دنوں خاکسار تحریک میں تھا - فاروقی صاحب نے میری ہمت افزائی کی - میں چاہتا تھا کہ علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کے تصنیف کردہ کتابچے " اسلام کا عسکری نظام " کا گجراتی میں ترجمہ کرکے چھپوایا جائے - جناب فاروقی صاحب نے میرا یہ مسئلہ حل کر دیا اور ایک ہزار کاپیاں چھاپ کر تقسیم کی گئیں (اس کی پاداش میں ، مجھے بی - اے کے بعد ایم - اے کے لیے بہاء الدین کالج میں داخلہ نہ مل سکا اور پرنسپل ظہور الدین احمد صاحب کے مشورے سے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی جا پہنچا) فتح محمد سندھی صاحب پولیس کے کمانی تھے اور بڑی رعب دار شخصیت کے مالک - جناب کامل جوناگڑھی ملک الشعراء تھے - جوناگڑھ ریاست کی تاریخ لکھی تھی - موسیقی کا صحیح علم رکھتے تھے-

لیکن سب میں نمایاں اور جاذب شخصیت قاضی احمد میاں اختر صاحب کی تھی - اس وقت حسین جمیل جوان لگتے تھے- ترکی ٹوپی شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس ایک شاندار وکٹوریا گاڑی میں سوار ہو کر آتے جاتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں-

معلوم ہوا کہ وہ جونا گڑھ ریاست کے رؤساء اور جاگیرداروں میں سے ہیں - راستے میں جب گاڑی میں بیٹھے ہوئے گزرتے تھے تو ہم ان کو گھور گھور کر دیکھا کرتے تھے- ہمیں بتایا گیا تھا کہ قاضی صاحب کا خاندان سندھ سے جونا گڑھ آیا تھا - شہر کے قاضی واڑے میں ان کی شاندار حویلی تھی-

کالج کی عمارت میں داخل ہونے کا دروازہ مشرق سے تھا اور داخل ہوتے ہی سامنے سے کالج لائبریری کا بڑا وسیع ہال تھا - البتہ اندر کی جانب دروازے سے متصل بائیں کو ایک کمرہ تھا جس پر ریاست کے آثار قدیمہ آفس کا سائن بورڈ (Department of Archaeology کچھ مزید الفاظ کے ساتھ) آویزاں تھا - میں اکثر اس بورڈ کو دیکھا کرتا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کس کا آفس ہے - ایک دن دیکھا کہ چپراسی اس کمرے کا دروازہ کھول رہا ہے- اندر دیکھا تو بڑے بڑے سائز کی ضخیم اور مجلد کتابیں خوبصورت الماریوں میں رکھی ہوئی نظر آئیں- اسی اثنا میں باہر دروازے کے سامنے ایک وکٹوریا گاڑی آکر رکی اور قاضی احمد میاں صاحب اترے اور کمرے کے دروازے کی طرف آئے - جب دیکھا کہ میں ان کی طرف تعجب سے دیکھ رہا ہوں تو پوچھا کہ آپ پڑھتے ہیں ، کہاں سے آئے ہیں؟ میں نے بتایا کہ میں سندھ سے آیا ہوں - پھر مزید شفقت سے پوچھا کہ آپ یہاں کھڑے ہو کر کیا دیکھ رہے تھے- میں نے کمرے کے بورڈ اور کمرے میں اندر کتابوں کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ دیکھ رہا ہوں کہ یہ کمرہ اور یہ کتابیں کس لیے ہیں - فرمایا یہ ریاست جونا گڑھ کے آثار قدیمہ کا محکمہ ہے اور میں اس کا نگراں ہوں - اس مختصر ملاقات کے بعد دوسری بار جب تشریف لائے تو میں ہمت باندھ کر اندر کمرے میں گیا - میرے ہاتھ میں ابن صاعد اندلسی کی کتاب طبقات الامم کا اردو ترجمہ تھا جو کئی سال پہلے خود قاضی صاحب نے کیا تھا - میں نے سلام عرض کیا اور کہا کہ آپ کا نام نامی دیکھ کر میں نے یہ کتاب لائبریری سے نکلوائی ہے اور اس کو پڑھ رہا ہوں- سن کر خوش ہوئے اور مجھے مزید مطالعے کی ترغیب دی-

شہر سے مشرق رویہ ، گرنار پہاڑ کی طرف جاتے ہوئے ہم ایک تراشے ہوئے گول پتھر پر کندہ شدہ کتبے دیکھتے تھے- ایک دن جب قاضی صاحب آثار قدیمہ کے اپنے آفس میں تشریف لائے تو میں نے اس کتبے کے بارے میں کچھ پوچھنے کا بہانہ بنایا تاکہ ان سے مل سکوں - یہ جان کر خوش ہوئے کہ مجھے کتبوں سے بھی دلچسپی ہے- پھر تفصیل سے سمجھایا کہ راجہ اشوک کے زمانے کے کتبے ہیں اور بہت ہی اہم ہیں- بہرحال شروع میں اس طرح مجھے قاضی صاحب سے ملنے اور متعارف ہونے کے مواقع حاصل ہوئے-

بہاء الدین کالج جونا گڑھ میں آل انڈیا مشاعرے منعقد کیے جاتے تھے- ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۰ء تک دو ایسے مشاعرے منعقد ہوئے - دونوں مشاعروں میں جناب جگر مرادآبادی تشریف لائے - متوسط قدوقامت ، چھوٹی سی کالی داڑھی (سفید ریش نہیں ہوئے تھے) ، شیروانی اور

پاجامے میں ملبوس ، سر پر کالی ٹوپی - وضع قطع میں لاابالی ، پان کا اتنا شوق کہ مونہہ کے دونوں اطراف گویا ریشہ آمیز - جونا گڑھ کے روساء میں سے ایک خوبصورت نوجوان جو اپنا تخلص قمر کرتے تھے ان ہی کے ہاں جگر صاحب مہمان ہوتے تھے - مقامی شعراء میں سے ریاست کے ملک الشعراء تو حضرت کامل تھے جو البتہ معمر تھے - ایک عجوبہ روزگار جونیجہ صاحب تھے ان کے آباء و اجداد کئی پشتوں سے سندھ سے ہجرت کرکے جونا گڑھ میں بس گئے تھے - جونیجہ صاحب مقامی جونا گڑھی (گجراتی اردو آمیز) زبان میں خوب شعر کہتے تھے اور اس میں انھوں نے اپنا ایک جداگانہ دیوان بنا رکھا تھا۔سب کو اپنے یہ اشعار شوق سے سناتے تھے - ایک غزل میں آخری قافیہ و ردیف والے الفاظ یہ تھے : "---ہونے تو دو " - وہ شستہ اردو میں بھی معیاری شعر کہتے تھے -

پہلا مشاعرہ جو ہم نے دیکھا وہ کالج کے اندر ہی منعقد ہوا - اس میں قاضی احمد میاں اختر صاحب منتظم اعلیٰ نظر آئے - بطور والینٹئر کے میں نے بھی انتظام میں حصہ لیا۔معلوم ہوا کہ ان مشاعروں کے حقیقی محرک قاضی صاحب ہی تھے۔دوسرے مشاعرے کے انتظام میں ، میں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قاضی صاحب مجھے کام میں مشغول دیکھ کر خوش ہوئے - جناب جگر صاحب مہمان خاص تھے - مصرع طرح تھا:

قدرت خدا کی ہے کہ خزاں ہے بہار میں

تقریباً چار گھنٹوں تک محفل جمی رہی - حضرت کامل جونا گڑھی کو اور حضرت جگر کو بڑے احترام سے سنا گیا - مجھے اعلیٰ اردو شاعری کی نزاکتوں سے اس وقت تک اتنی آگہی نہ تھی کہ اچھے اشعار ازبر ہو جائیں - البتہ جونیجہ صاحب کی مزاحیہ نظم پر ہم نے خوب قہقہے لگائے۔مصرع طرح کی تضمین کرتے ہوئے انھوں نے یہ شعر پیش کیا اور خوب داد حاصل کی:

بیٹھا ہوا رقیب ہے پہلوئے یار میں
قدرت خدا کی ہے کہ خزاں ہے بہار میں

بہرحال ان دنوں جناب قاضی احمد میاں اختر صاحب کی شخصیت جونا گڑھ کی علمی و ادبی محفلوں کا مرکز و محور تھی -

میں سنہ ۱۹۴۱ء میں جونا گڑھ سے علی گڑھ پہنچا اور مسلم یونیورسٹی میں ایم - اے کے لیے شعبہ عربی میں داخلہ لیا - پروفیسر مولانا عبدالعزیز میمن شعبے کے صدر تھے - جب ان کو معلوم ہوا کہ میں جونا گڑھ سے آیا ہوں تو قاضی صاحب کے متعلق پوچھا اور فرمایا کہ وہ ہمارے دوست ہیں - اپنی گفتگو میں میمن صاحب قاضی صاحب کے علم و فضل کی داد دیا کرتے تھے - اور یہ سن کر مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ ہم جونا گڑھ میں قاضی صاحب کو دیکھتے تو تھے لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے فاضل ہیں کہ استاذ میمن صاحب جیسے جبل العلم بھی ان کی اتنی قدر کرتے ہیں -

سنہ ۱۹۴۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے میں امریکا (کولمبیا یونیورسٹی) چلا گیا۔ وہاں سے سنہ ۱۹۴۹ء میں واپس کراچی پہنچا جو اب پاکستان کا پایہ تخت تھا۔ میں ڈاکٹر تو بن کر آیا تھا لیکن ملازمت کے لیے دروازے بند تھے - ایک سال سے زیادہ عرصے تک پریشان حال رہا تاآنکہ مئی ۱۹۵۰ء میں مرحوم شیخ محمد اکرام نے (جو اس وقت منسٹری اف انفارمیشن اور براڈکاسٹنگ ڈویژن میں جوائنٹ سیکریٹری تھے) کہیں مجھے دیکھ کر درخواست دینے کو کہا اور اپنی ڈویژن میں "افسر بکار خاص" (O.S.D) کے طور پر منتخب فرمایا اور میں قدرت اللہ شہاب مرحوم (جو اس وقت ڈپٹی سیکریٹری تھے) کے ماتحت کام کرنے لگا۔ اکرام صاحب نے غالباً میرے مضامین دیکھے تھے۔ جو رسالہ "اسلامک کلچر" (حیدرآباد دکن) میں چھپے تھے - ایک دن مجھے اپنے آفس بلا کر کہا کہ انجمن ترقی اردو میں مولانا عبدالحق صاحب کے ذاتی کتب خانے میں "شرف نامہ احمد منیری" نام کی فارسی کتاب کا ایک قلمی نسخہ ہے جو میں چاہتا ہوں کہ آپ دیکھیں اور اس پر ایک مضمون لکھیں - آج شام آپ میرے ساتھ چلیں تاکہ مولانا صاحب سے مل کر یہ کتاب حاصل کی جائے - چنانچہ اکرام صاحب کے ساتھ میں انجمن ترقی اردو میں مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اکرام صاحب نے اچھے الفاظ میں میرا تعارف کرایا - مولانا نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کہاں تعلیم پائی ہے اور یہ کہ فارسی سے کتنا مانوس ہیں کہ اس قلمی کتاب کو پڑھ سکیں - میرے جواب سے پہلے اکرام صاحب نے انھیں مطمئن کر لیا - البتہ میں نے ان کو بتایا کہ قیام پاکستان سے پہلے میں یہاں پر کراچی میں انجمن ترقی اردو کی برانچ کی لائبریری کا میمبر تھا جو پاکستان چوک کے قریب واقع تھی - سن کر مزید مطمئن ہوئے - اتنے میں قاضی احمد میاں اختر صاحب آگئے - میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا اور اٹھ کر مصافحہ کیا - بعد میں نیچے آکر (اتنا یاد پڑتا ہے کہ ہم مولانا سے ملنے یا کتاب نکلوانے کے سلسلے میں سیڑھی چڑھ کر اوپر گئے تھے) قاضی صاحب سے اپنا تعارف کروایا اور جوناگڑھ کی یادیں تازہ کیں - بہت بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میں چاہوں گا کہ آپ کے علمی مشاغل سے باخبر رہوں - خاص موقعوں پر آپ مجھے یاد کیا کریں اور میرے پاس آیا کریں - مجھے اپنے مکان کا پتہ بتا دیا جو گاڑی کھاتے کے سامنے بندر روڈ پر ٹھٹائی کمپاؤنڈ بلڈنگ کی چوتھی منزل پر ایک "فلیٹ" تھا۔

شرف نامے کا یہ قلمی نسخہ کرم خوردہ اور بوسیدہ تھا - بعض عبارتوں کو پڑھنا اتنا آسان نہ تھا - شیخ محمد اکرام صاحب کی ترجیحات کا مجھے کچھ اندازہ تھا - لہٰذا میں نے چاہا کہ کتاب کے تاریخی اور ثقافتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں - ابتدائی مطالعے سے ہی معلوم ہو گیا کہ مصنف ابراہیم قوام فاروقی نے اپنی کتاب کا انتساب بہار کے بزرگ شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری کے نام نامی سے کیا - لیکن انھوں نے یہ کتاب بنگالہ میں لکھی - لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ اس

زمانے میں بنگالہ کے تاریخی و علمی پس منظر پر روشنی ڈالی جائے - اس سلسلے میں کچھ حالات جمع کیے اور پھر قاضی صاحب سے منظورہ کیا - میری کوشش کو دیکھ کر خوش ہوئے اور پھر اپنی معلومات سے نوازا جس کا ذکر خیر میں نے اپنے مضمون کے حواشی میں کر دیا - قاضی صاحب نے کہا کہ مضمون مکمل ہو جائے تو شیخ محمد اکرام اور مولانا عبدالحق کے علاوہ ایک کاپی مجھے بھی دیجیے گا تاکہ انجمن کے رسالہ اردو میں شایع کیا جائے- چنانچہ میں نے ایک کاپی جناب قاضی صاحب کے حوالے کر دی اور انھوں نے اسے رسالہ اردو ، بابت ماہ اکتوبر ۱۹۵۲ء اور بابت جنوری - اپریل ۱۹۵۳ء میں دو قسطوں میں شایع کروا دیا - عنوان ہے " مسلم بنگال کے فارسی ادب کی ایک اہم تصنیف : کتاب شرف نامہ احمد منیری" -

مئی ۱۹۵۰ء تا اگست ۱۹۵۱ء میں انفارمیشن اور براڈکاسٹنگ ڈویژن میں بطور او - ایس - ڈی کام کرتا رہا اور میرا قیام کراچی میں ہی رہا - اس مدت میں جناب قاضی صاحب سے ان کے گھر پر ملاقاتیں ہوتی رہیں- ان کا کتب خانہ بڑا تو نہیں تھا لیکن اس میں تحقیق و تجسس کے لیے کافی کچھ کام کی کتابیں موجود تھیں - میں اس وقت دیبل کے محل وقوع پر کام کر رہا تھا اور مجھے ایلیٹ ڈاؤسن کی مرتب کردہ تاریخ جلدوں میں سے پہلی جلد کی ضرورت تھی- قاضی صاحب سے ذکر کیا تو فرمایا میری کتابوں میں موجود ہے- پھر کتاب لے آئے اور میرے حوالے کر دی- ان دنوں ملازمت کی ذمے داریوں کے علاوہ میرے پسندیدہ مشغلے یہ تھے : ۱- کراچی میں ان نووارد فضلاء کو جو تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے سندھ کی تاریخ اور تاریخی آثار سے روشناس کروانا ۲- حضرت شاہ عبداللطیف اور سندھی موسیقی کے تعارف کے سلسلے میں محفلیں منعقد کرنا ۳- مرحومہ عطیہ بیگم کی ادبی ثقافتی محفلوں کا کاروبار سنبھالنا اور ، ۴- " پین " (P.E.N) تنظیم (جس کے صدر جناب شاہد سہروردی تھے) کے زیر سایہ محفلوں کا انتظام سنبھالنا (جیسا کہ مرحوم شہاب صاحب چاہتے تھے) - ان سلسلوں کے خاص خاص موقعوں پر قاضی صاحب کو بلا ناغہ اطلاع دے کر ان کی رفاقت کی سعادت حاصل کرتا رہا - قاضی صاحب کو موسیقی سے خاص شغف تھا اور موسیقی کی محفلوں میں بہت محظوظ ہوتے تھے - عرب - اسلامی دور کی تاریخ کے سلسلے میں ، میں نے دیبل کے محل وقوع پر مقالہ لکھا اور محکمہ آثار قدیمہ کے زیر انتظام ایک محفل میں اس کو پیش کیا - مرحوم ممتاز حسن (اس وقت فیڈرل مالی سیکریٹری) نے اور جناب قاضی صاحب نے بہت پسند فرمایا - اس مقالے میں ، میں نے دیبل کو بنبھور کے کھنڈرات سے مشخص کیا تھا - قاضی صاحب نے تقاضا کیا کہ میں رہنمائی کروں تاکہ بنبھور کے کھنڈرات دیکھے جائیں - اس مہم میں اور احباب بھی شریک ہوئے اور قاضی صاحب نے مولانا ہاشمی فرید آبادی کو جو اس وقت انجمن میں کام کرتے تھے شمولیت کی دعوت دی - اس طرح بعد میں ہم ٹھٹہ دیکھنے گئے -

۱۹۵۱ء کے وسط میں پاکستان پبلک سروس کمیشن نے مجھے " پریس اتاشی " کے عہدے کے لیے منتخب کیا اور اگست میں دمشق میں میری تقرری کا فیصلہ ہوا - اب میں نے جا کر قاضی صاحب کو بتایا خوش تو ہوئے لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ آپ کا باہر چلا جانا ہم پر گراں گزرے گا- ان کے یہ الفاظ میرے دل میں بس گئے - مجھے تیاری کا الاؤنس ، مل گیا اور دمشق جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ قبلہ علامہ آئی آئی قاضی ، وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سے کراچی تشریف لائے اور پیغام بھیجا کہ میں ان سے ملوں - جا کر ملا تو پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہیں- میں نے بتایا کہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے میرا انتخاب ہوا ہے اور دمشق جانے کی تیاری کر رہا ہوں کہ وہاں پر میری تقرری ہوئی ہے - سن کر انھوں نے زور دار ترغیب دی کہ میں رک جاؤں اور سندھ یونیورسٹی میں " پروفیسر آف ایجوکیشن " کا عہدہ سنبھال لوں - قبلہ علامہ قاضی صاحب سے کالج کے دنوں سے عقیدت تھی - میں نے عرض کیا کہ قبلہ میں خدمت تعلیم کو گورنمنٹ سروس پر ترجیح دیتا ہوں مگر سندھ یونیورسٹی تو ایک ممتحن یونیورسٹی ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہاں سے کبھی بھی مجھے رخصت کر دیا جائے - فرمایا کہ میں سندھ یونیورسٹی کو ایک مثالی تربیت گاہ بنانا چاہتا ہوں اب یہ " ریزیڈنشل ٹیچنگ یونیورسٹی " ہو گی اور یہ بسم اللہ آپ ہی کی تقرری سے ہو گی - مزید یہ کہ آپ کی تقرری کے آرڈر میں لکھ دیا جائے گا کہ ریٹائرمنٹ تک آپ کو سکیورٹی آف ٹینیور دی گئی ہے -

یہ تو ان کی شفقت تھی البتہ میرے لیے صبر آزما صورت حال سامنے تھی کہ دمشق جانے کو خیرباد کہوں - دو روز گزرے ہی تھے کہ قبلہ علامہ صاحب نے یکم ستمبر ۱۹۵۱ء سے سندھ یونیورسٹی میں میری تقرری بطور پروفیسر آف ایجوکیشن کا آرڈر بھجوا دیا جس میں " ٹینیور " کا بھی اندراج تھا - یہ تیس اگست کا دن تھا- قبلہ علامہ صاحب کی ترغیب کے مدنظر مجھے اتنی توفیق ہوئی کہ دوسرے دن یعنی ۳۱ اگست کو میں شہاب صاحب اور اکرام صاحب سے ملا اور ان کو اپنے استعفے کے فیصلے سے آگاہ کیا دونوں نے سمجھایا کہ میں اتنی اچھی ملازمت نہ چھوڑوں لیکن میں نے ان کو منوایا کہ میرا استعفیٰ قبول کر لیا جائے - دونوں کرم فرما پھر مجھے سیکریٹری مسٹر جی- احمد کے پاس لے گئے جنھوں نے بعض مراعات کے حوالے سے مجھے ترغیب دی کہ میں ملازمت نہ چھوڑوں میں نے شکریہ ادا کیا اور گزارش کی کہ میں تعلیم کی خدمت کی خاطر یونیورسٹی کی ملازمت کو ترجیح دے رہا ہوں - لہذا میرا استعفیٰ قبول کر لیا جائے - اس پر جی - احمد صاحب نے پوچھا کہ آپ کب جانا چاہتے ہیں - میں نے کہا آج ہی - اس پر انھوں نے فائل پر دستخط کر دیے- اسی دن میں قاضی صاحب کے ہاں پہنچا اور کہا کہ : قبلہ ، میں ایک خوشخبری لایا ہوں اور وہ یہ کہ میں دمشق نہیں جاؤں گا - حیران رہ گئے کیوں کہ دو چار روز پہلے ہی میں ان کو بتا چکا تھا کہ ملک سے باہر جانے

والا ہوں - جب انھوں نے سنا کہ قبلہ علّامہ قاضی صاحب کی ایماء پر میں سندھ یونیورسٹی جا رہا ہوں اور آج ہی استعفیٰ دے کر آیا ہوں تو خوش ہو کر فرمایا کہ : ہاں بھائی جاؤ اور ہمیں بھی لے جاؤ - میں نے دل ہی دل میں سوچ لیا کہ ان شاء اللہ قاضی صاحب کو سندھ یونیورسٹی میں بلایا جائے گا-

یکم ستمبر ۱۹۵۱ء کو جا کر میں نے سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر آف ایجوکیشن اور صدر شعبۂ تعلیم کی ذمے داری سنبھال لی - اس طرح پاکستان کی تعلیمی تاریخ میں پہلی بار یونیورسٹی سطح پر شعبۂ تعلیم کا اجراء ہوا اور فیکلٹی آف ایجوکیشن قائم ہوئی وائس چانسلر علامہ قاضی صاحب ایک باکمال مفکر ہونے کے علاوہ بڑے تعلیمی مدبر و منتظم بھی تھے اور یونیورسٹی کو صحیح معنوں میں ایک اعلیٰ تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے - اس سلسلے میں انھوں نے مجھے کلی طور پر اپنے اعتماد میں لیا ہوا تھا تعلیمی شعبوں کا اجراء ، تجدید نصاب وغیرہ تعلیمی امور میرے سپرد تھے - ۱۹۵۱ء - ۱۹۵۲ء کے دوران شعبۂ تعلیم کے بعد علامہ صاحب نے شعبۂ دین کا اجراء منظور فرمایا - ۱۹۵۳ء - ۱۹۵۴ء کے دوران شعبۂ تعلیم کے علاوہ حتی المقدور فیکلٹی آف آرٹس کی تکمیل پیش نظر رہی میں نے تین شعبوں - مسلم ہسٹری ، سندھی اور اردو ، کو اولیت دینے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی مسلم ہسٹری کے اجراء کے لیے قاضی احمد میاں صاحب کو بلانے کی تجویز پیش کی - قاضی صاحب کی ذاتی صفات اور علمی کارناموں کا ذکر کیا اور کتاب " طبقات الامم " کا اردو ترجمہ علامہ صاحب کے سامنے رکھا جس کو دیکھ کر خوش ہوئے - پھر مجھے اجازت دی کہ میں قاضی صاحب کو لکھوں تاکہ وہ ایک دن کے لیے تشریف لائیں - چنانچہ میں نے قاضی صاحب کو لکھا اور وہ میرے ہاں حیدرآباد تشریف لائے اور ہم دونوں مل کر، علامہ صاحب سے ان کے گھر جا کر ملے - کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی اور علامہ صاحب نے خوش ہو کر قاضی صاحب سے کہا کہ ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ شعبہ مسلم ہسٹری کے صدر اور پروفیسر کے طور پر ہمارے یہاں یونیورسٹی میں آ جائیں - قاضی صاحب نے قبول کر لیا اور رخصت ہو کر فی الحال واپس کراچی چلے گئے - البتہ یہ پوچھا کہ حیدرآباد میں ان کے رہنے کے انتظام کا کیا ہو گا - علامہ صاحب نے دوسرے روز قاضی صاحب کی تقرری بحیثیت " پروفیسر آف مسلم ہسٹری " منظور کر لی اور جو نئے کوارٹر بنے تھے ان میں سے ایک قاضی صاحب کے لیے مخصوص کرا دیا - قاضی صاحب کو ان کی تقرری کا آرڈر ہاتھوں ہاتھ پہنچا دیا گیا اور وہ فوراً حیدرآباد پہنچے اور شعبہ مسلم ہسٹری کے صدر اور پروفیسر کی ذمہ داری سنبھال لی-

قاضی صاحب کی آمد کے بعد میں نے حتی المقدور کوشش کی کہ ان کو کوئی تکلیف پیش نہ آئے - ڈپارٹمنٹ کی ضروریات کے سلسلے میں رجسٹرار سے خط و کتابت اور مسائل کو حل کرانے میں قاضی صاحب سے میرا کلی طور پر تعاون رہتا تھا اور وہ ہر طرح مطمئن رہے - قاضی صاحب

حضرت شاہ عبداللطیف کا مزار دیکھنا چاہتے تھے اور ہم ساتھ مل کر وہاں گئے۔ اس طرح ہالا ، ٹھٹہ اور مکلی کو گئے - دوران گفتگو ذکر کیا کرتے تھے کہ ان کے آباء و اجداد ٹھٹہ سے جونا گڑھ آئے تھے۔ قبلہ علاّمہ صاحب کے ہاں ہم اکثر ساتھ ہی مل کر جایا کرتے تھے - علاّمہ صاحب قاضی صاحب کو چاہتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے۔

۱۹۵۳ء - ۱۹۵۴ء کے دوران اساتذہ اور طلبہ کی تربیت کے لیے ایکسٹینشن لیکچرس کا سلسلہ علامہ قاضی صاحب کی ایماء پر شروع ہوا - یہ لیکچرس ہر جمعے کو (بعد از نماز جمعہ) مرکزی ہال میں منعقد کیے جاتے تھے اور علامہ صاحب صدارت فرماتے تھے - کوئی ایک پروفیسر یا صدر شعبہ اپنے تخصص کے دائرے میں سے کسی موضوع پر مقالہ پیش کرتا تھا اور بعد میں علاّمہ قاضی صاحب اپنا صدارتی خطاب فرماتے تھے - جب ان لیکچرس کا پہلا پروگرام مرتب ہوا تو قاضی احمد میاں صاحب نے اپنے مقالے کے لیے " مسلمانوں کے بعض سائنسی اختراعات " کا موضوع تجویز کیا انگریزی میں عنوان تھا

" Some Muslim Contributions to Scientfic Inventions"

میں نے ان کی طرف سے یہی موضوع لیکچرس کے پروگرام میں لکھوا دیا - قاضی صاحب نے اپنا مقالہ انگریزی میں پڑھا اور بعض وضاحتیں فی البدیہہ کرتے گئے - یہ مقالہ ایک نئے انداز کا تھا اور دلچسپی سے سنا گیا اور پسند کیا گیا - بعد میں قاضی صاحب سے کاپی لے کر ان کا یہ مقالہ میں نے پندرہ روزہ انگریزی اخبار The Torch مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۵۴ء میں چھپوا دیا (ملاحظہ ہو ضمیمہ اول)

اسی اثناء میں قاضی احمد میاں صاحب نے ایک اہم تجویز یہ پیش کی کہ بیرونی کی کتاب غرۃ الزیجات (کہ جو بیرونی نے سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کی تھی) کا واحد قلمی نسخہ احمد آباد میں پیر محمد شاہ کی مسجد کے کتب خانے میں پایا جاتا ہے۔ سندھ یونیورسٹی سے اس کا عربی متن نیز اس کا انگریزی ترجمہ مع حواشی و تعلیقات شایع کیا جائے - ہم دونوں مل کر علاّمہ قاضی صاحب سے جا کر ملے علاّمہ صاحب نے پوچھا کہ یہ مخطوطہ کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ کون اس کا انگریزی میں ترجمہ کرے گا اور حواشی لکھے گا۔ قاضی صاحب نے کہا : مخطوطے کے عکس حاصل کرنے کا انتظام میں کروں گا۔ اور یہ کہ اس کے انگریزی میں ترجمے اور حواشی کا کام ایک صاحب بنام فضل الدین قریشی کے سپرد کیا جا سکتا ہے جو لاہور میں یونیورسٹی یا کسی کالج میں طبیعیات کے استاد ہیں وہ عربی سے مانوس ہیں اور یہ کہ کتاب کا موضوع علم نجوم (Astronomy) ہے اور وہ اس کو سمجھ لیں گے۔ علاّمہ صاحب نے قاضی صاحب کی یہ سفارش قبول کرتے ہوئے اس منصوبے کی منظوری دے دی - قاضی صاحب نے مزید وضاحت کی کہ ڈاکٹر بلوچ میرے ساتھ

مل کر اس کام کی نگرانی کریں گے - ہم دونوں خوش ہو کر واپس آئے لیکن قاضی صاحب بہت خوش ہوئے کہ علامہ قاضی صاحب نے ان کی علمی تجویز کو فوری طور پر منظور کر لیا - کچھ دنوں کے بعد قاضی صاحب نے مجھے بتایا کہ مخطوطے کے دو تین عکس لیے گئے ہیں اور وہ کسی صاحب کی وساطت سے عنقریب کراچی پہنچنے والے ہیں - عکس پہنچے تو قاضی صاحب نے تجویز کیا کہ فضل الدین قریشی کو بلایا جائے - وہ جب آئے تو یہ کام انھیں سپرد کیا گیا - قاضی صاحب نے جو ان کے لیے اتنی اچھی رائے دی تھی ، اس کے مدنظر قریشی صاحب کو بعد میں بلا کر فزکس ڈپارٹمنٹ میں مقرر کروایا تاکہ وہ یہاں اس کام کو پورا کر دیں - افسوس کہ وہ مقررہ مدت میں یہ کام نہ کر سکے اور واپس لاہور چلے گئے - ان کو بار بار لکھا گیا لیکن انھوں نے ایفائے عہد کے بجائے تغافل سے کام لیا (۱)

قاضی صاحب کی وفاتِ ناگہانی

سال ۱۹۵۵ء کے شروع سے ہی قاضی احمد میاں صاحب کبھی کبھار علیل ہونے لگے - لیکن یہ علالت ایک دن کی ہوتی تھی اور دوسرے دن وہ آفس میں آ جاتے تھے - غالباً مارچ میں وہ ایک دن کے بعد دوسرے دن بھی آفس میں نہ آئے تو میں ان کے گھر جا کر ان سے ملا - چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اور سرہانے کے دونوں طرف کتابیں پڑی ہوئی تھیں - میں نے مزاج پرسی کی اور کہا کہ کسی ڈاکٹر سے رجوع کیا جائے - فرمایا کہ تشویش کی ضرورت نہیں - مجھے ایک عرصے سے قلب کا عارضہ " انجائنا " ہے - دوا میرے پاس ہے اور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا ہوں (یہ کہہ کر چھوٹی سفید گولیاں دکھائیں) - آرام کر لیتا ہوں تو طبیعت ٹھیک ہو جاتی ہے - چنانچہ دوسرے دن آفس تشریف لائے - اس کے بعد کبھی کہیں ایک دن ناغہ کر لیتے تھے تو میں اس کو " نارمل " ہی سمجھتا تھا -

۱۶ اگست علی الصباح قاضی صاحب کے گھر سے بچی دوڑتی ہوئی میرے گھر پہنچی اور مجھے کہا کہ آپ جلدی سے چلیں قاضی صاحب کو کچھ ہو گیا ہے - میں فوراً چل پڑا - بچی کے ساتھ جب کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ قاضی صاحب اپنی چارپائی پر بالکل سیدھے لیٹے ہوئے ہیں اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سو رہے ہیں - ایک ٹانگ بالکل سیدھی تھی اور دوسری زانو سے اندر کی طرف مڑی ہوئی تھی - آنکھیں بند تھیں - ہاتھ دونوں مڑے ہوئے سینے پر دھرے ہوئے تھے - میں نے ایک دو آوازیں دیں اور بعد میں ان کی ٹانگ کو اور ہاتھوں کو موڑ کر بازوؤں کو سیدھا کر دیا - میں سمجھ گیا کہ قاضی صاحب فوت ہو چکے ہیں لیکن اعضاء اتنی آسانی سے مڑ رہے تھے کہ امید ہوئی کہ ایسا شاید نہ ہو اس امید پر میں بھاگ کر حکیم شمس الدین صاحب کے داماد ڈاکٹر بھرگڑی کو بلا

کے لایا - انھوں نے معائنہ کر کے بتایا کہ قاضی صاحب تقریباً دو گھنٹے پہلے فوت ہو چکے ہیں - اس سے اندازہ ہوا کہ وہ ۱۷ اگست کو صبح ۴ بجے کے قریب فوت ہوئے - دونوں ہاتھ جو ان کے سینے پر رکھے ہوئے تھے اس سے معلوم ہوا کہ عارضہ قلب " انجائنا " جان لیوا ثابت ہوا -

میں نے قاضی صاحب کے بچوں کو فوراً کراچی روانہ کر دیا ، اور پھر غسل و تجہیز و تکفین کا انتظام کیا - قبلہ علامہ قاضی صاحب کو اطلاع دی - انھوں نے پوچھا کہ میت کو کراچی پہنچانے کا کیا انتظام کیا گیا ہے - میں نے بتایا کہ حیدرآباد میمن جماعت سے " بس " ملنے کی امید ہے اور میں خود میت کے ساتھ کراچی جاؤں گا - میں نے مزید کہا کہ مناسب ہے کہ پسماندگان سے ہمدردی کے طور پر یونیورسٹی سے ایک ریزولیوشن پاس کیا جائے اور رجسٹرار کے دستخط سے بھیجا جائے - فرمایا کہ میں خود تعزیت کا پیغام یونیورسٹی کی طرف سے بھیجوں گا اور وہ آپ اپنے ساتھ لیتے جائیں - جماعت کی گاڑی دس بجے کے قریب ملی اور نماز جنازہ کے بعد قبلہ علامہ صاحب سے تعزیتی پیغام (ضمیمہ دوم) لے کر میں اکیلا میت کو سنبھالے ہوئے کراچی روانہ ہوا - اتفاقاً اس دن جنوب مغرب سے جو روزانہ ہوا چلتی تھی اس نے بڑی شدت اختیار کر لی - کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ قاضی صاحب کی وفات پر فطرت بھی جنبش میں آ گئی ہے - ان دنوں کراچی جانا ہوتا تھا تو براستہ ٹھٹہ جایا کرتے تھے - ہم نے جب دابھی کو کراس کیا تو گاڑی میں پیٹرول ختم ہو گیا - پیٹرول تو ہم کافی لے کر چلے تھے لیکن سامنے کی ہوا کے غیر معمولی دباؤ کی وجہ سے پیٹرول ختم ہو گیا - میں نیچے اترا اور گزرنے والی گاڑیوں کو ہاتھ دے کر روکنے لگا - موٹر کاروں والے حضرات تو رکے کر پھر معذرت کے ساتھ چل پڑتے تھے - بالآخر ایک ٹرک کا قلندر صفت ڈرائی ور رکا ، مجھ سے ہمدردی کی اور دو گیلن کے قریب پیٹرول نلکی (پائپ) سے نکال کر دیا - جب آگے والے پیٹرول پمپ پر پہنچا تو پیٹرول ڈلوایا - اس طرح ان کے آخری سفر میں مجھے قاضی احمد میاں اختر کے ساتھ دو گھنٹے مزید رفاقت کا موقع ملا اور یہ صحبت ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو گئی - انا للہ وانا الیہ راجعون -

---

حاشیہ

(۱) قاضی احمد میاں فوت ہوئے اور بعد میں علامہ قاضی صاحب وفات پا گئے - میں لاہور جا کر فضل الدین صاحب سے ملتا رہا اور یاد دہانی کرتا رہا - غالباً ۱۹۷۰ء میں یا اس کے بعد میں ان سے آخری بار سمن آباد میں ان کے گھر پر جا کے ملا - میرے اصرار پر انھوں نے

بتایا کہ وہ ترجمہ پورا کر چکے ہیں یا پورا کرنے والے ہیں لیکن اشاعت کے لیے سندھ یونیورسٹی کو دینے میں ان کو تامل تھا۔ کہا کہ بھارت میں کوئی پنڈت ہیں جو اس کا مقدمہ لکھیں گے اور پھر یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی سے شایع ہو گی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہنے لگے کہ انھوں نے اپنا ترجمہ یا کتاب کا متن کراچی میں صمد حسین رضوی صاحب کو بھیجا تھا اور انھوں نے شایع کر لیا ہے بعد میں صمد حسین صاحب سے میری ملاقاتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ ان کو ہندو مصنفین کی نجوم پر لکھی ہوئی قدیم کتابوں پر بڑی دسترس حاصل ہے جب وہ اس موضوع کو خوب سمجھتے تھے تو ان کو قریشی صاحب کے ترجمے کو نقل کرنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ البتہ صمد حسین صاحب کو "غرۃ الزیجات" کا متن قریشی صاحب سے ملا اور یہ اسی متن کا عکس تھا جو قاضی احمد میاں اختر نے حاصل کیا تھا اور قریشی صاحب کو دیا گیا تھا۔ عبدالصمد صاحب نے مصلحتاً یہ لکھا کہ انھوں نے کتاب کا عکس براہ راست احمد آباد سے حاصل کیا ہے۔ بہرحال عبدالصمد صاحب نے کافی وافی حواشی کے ساتھ انگریزی میں غرۃ الزیجات پر کامینٹری لکھی اور ان کا یہ کارنامہ ہمدرد فاؤنڈیشن سے شایع ہوا۔ فضل الدین قریشی کے کارنامے کا کیا ہوا میں یہ معلوم نہ کر سکا۔ میں نے قاضی صاحب مرحوم کی یاد میں "غرۃ الزیجات" کے عربی متن پر کام شروع کیا اور بیرونی کی آٹھ سو سالہ برسی کے موقع پر (جو یونیسکو کے پروگرام کے تحت پاکستان میں منائی گئی) اس کو ۱۹۷۳ء میں سندھ یونیورسٹی سے شایع کیا۔

(اس مقالے سے دو انگریزی ضمیمے بھی منسلک ہیں جنھیں آئندہ اوراق میں اردو صفحات نمبر کی ترتیب کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔)

ضمیمہ اوّل

PHONE NOS. { Office 229
Residence 241.

Vice-Chancellor.

University of Sind,
Hyderabad Sind

6 - 8 - 1955.

Message of Allama I.I.Kazi, the Vice-Chancellor, Sind University, to the family of late Professor Kazi Ahmad Mian Akhtar.

.....

Sind University mourns the loss of one of its ablest and best Professors, Kazi Ahmad Mian Akhtar marhoom, whom it will be very difficult to replace. The time that Professor Akhtar remained in this University, he did most useful work. He was most loyal to the University and was a special support to the Vice-Chancellor, who could have his wise counsel at any time.

I and the entire staff sincerely sympathise with the children and the relatives of our friend and colleague. May God grant them strength to bear this great loss with patience.

I. I. Kazi

(I.I. Kazi)
Vice-Chancellor

ضمیمۂ دوم

THE FRIDAY TALKS IN SIND UNIVERSITY
WITH
PRESIDENTIAL REMARKS BY ALLAMA I.I. KAZI

" SOME MUSLIM CONTRIBUTIONS TO SCIENTIFIC INVENTIONS '
BY PROF KAZI AHMAD MIAN AKHTAR, HEAD OF THE DEPT.
OF MUSLIM HISTORY, UNIVERSITY OF SIND.

Clocks

The work (ساعۃ) Sa'a has been used for clocks, which may be an abbreviation of Alat as-Sa'a or instrument of ascertaining the hour. The early muslims knew the Sun-dial and other instruments of primitive type which must have enabled them to know the different periods of day and night. The earliest mention of a a clock in histroy is that sent by Harun al-Rashid to Charlemagne in 807 A.D., and though we do not come across this reference in any Arabic historical work, but it has been stated authentically by Einhard the Latin historian of the Crusades. A little later, towards the middle of the same century, we hear of various contrivances. We find reference of water-clocks and Sun-dials in the great work of al-Jahiz (d. 868-69) Kitab al-Hayawan (P.41, Cairo ed. 1323 A.H.) The most important work in Arabic on clocks is Kitab fi ma'rifat al hiyal al-Hindiyya, composed in the year 602 H. 1205/6 A. D. by Ismail bin Razzaz al-Jazari. The author has described in detail construction of ingenious clocks which get their name from the particular figures that appear on them e.g. ape-clock, elephant-clock, sharp shooter-clock, drummer-clock, writer-clock etc.

Description of the clock on the gate of the al-Mustansiriyya College at Baghdad, has been given by Arab historians. It was constructed by the order of al-Mustansir the Abbasid Calip who died in 640 H. Its dial was made of Lapis Lazuli (لاجورد) in the from of a planetarium on which a Sun was set in rotatory motion and showed correct time. (al-Qazwini, Athar, P. 211, German ed.)

At the close of the sixth century H., the clockmaker Ridwan's work on astronomical clocks appeared, of which a manuscript is preserved in the Gotha library, with illustrations of the mechanism. The famous clock in the great mosque of Damascus is described in this book which was constructed by Ridwan's father. The clock being damaged, was repaired by Ridwan, as he himself has stated in the preface of his book. This clock has been decribed by the Spanish muslim traveller Ibn Jubair who saw it during has visit to Damascus in 579 H. (Travels, pp. (220-221, Cairo ed.) In Spain there were several clock makers who constructed different kinds of clocks, as it appears from the Arabic works of a Jewish writer of Seville, Ishaq ibn Sid (1263-1277), on (1) Stone-dial, (2) Water - clocks (3) Quicksilver-clocks (4) Candle-clocks etc.

The invention of the pendulum (رقّاص) is also due to the muslim astronomer Ibn Yunus (1009). In this connection Draper observes:-

> " In their measurement of time they were successful, they had several kinds of clepsydras. A balance clepsydra is described in the work from which I am quoting. But it was the great astronomer Ebn Junis who accomplished the most valuable of all chronometric improvements. He first applied the pendulum to the measure of time. " (Intell. Devel., ii, 49).

Of clocks with wheels (ساعات الدوريه) which first reached the East from Spain in the sixteenth century an account is given by Taqi-al-Din Abu Bakr Muhammad b Ma'ruf al-Rasid (932) in his work composed in 1552/53 entitled

شفاء الاسقام في وضع الساعات على الرخام

Flying Machine

The Aeronautics is cosidered to be the discovery of modern science and there is no doubt that the aeroplane is one of the greatest invention of the modern age. But it must be remembered that the first flying apparatus was contrived by a muslim scientist as far back as the ninth century. This is neither a legend nor a fiction, but a real historical fact stated by the muslim historian of Spain al-Maqqari in his stupendous work Nafh al-Tib composed between 1628 and 1630 A. D. He tells us that in Spain there was a scientist named Abu'l Abbas Qasim ibn Firnas who first made glass out of stone, who established fabrics of it in Spain, invented an istrument called al-Minqala by means of which time was marked with music without having recourse to notes or figures. He also contrived a planetarium in his house. Among other very curious expriments which he made, one is his trying to fly. He covered himself with feathers, attached a couple of wings to his body and getting on an eminence, flung himself down into the air, when according to the testimony of several trust-worthy writers who witnessed the performance, he flew to a considerable distance as if he had been a bird, but in alighting again on the place whence he had started, his back was very much hurt for not knowing that birds when they alight, come down upon their tails, he forgot to provide himself with one. Philip K. Hitti, in his History of the Arabs has stated that, " Ibn Firnas was the first man in Arab history to make a scientific attempt at flight. (P.598) Lewis Mumford in his Technics of Civilization (P. 22), writing about Aeronautics, says: "As with so many elements in our culture the

original impulse was imparted in his movement by the Arabs as early as 880 A. D. Unfortunately we are not in a position, in the absence of full information regarding the size and form of the suit, to judge the merits of the appliances and the principles involved in this soaring flight.

Gunpowder

The chemical compound of gunpowder was first invented by the muslims who used it in their sieges and battles. The European historians have attributed this invention to the Chinese and the Greeks. There is hardly any justificaion for this assertion which is mostly due to confounding gunpowder with Greek fire. The Chinese origin is a mere conjecture. The American scientist Draper gives the credit to Arabs for this invention as he writes:-

> "The practical Arabs had not long been engaged in these fascinating but wild pursuits, when results of a very great importance began to appear. In a scientific point of view, the discovery of the strong acids laid the true foundation of chemistry; in a politial point of view, the invention of gunpowder revolutionized the world.

Juriji Zaidan the Christian Arabic author of Egypt says: 'In our investigation it has been proved that the muslims were the first to invent gunpowder, which is a chemical preparation." Edward Gibbon has mixed upto two issues as he says"-

> "The use of the Greek fire, or it might now be called the Saracenic fire, was continued to the middle of the fourteenth century, when the scientific or causal compound of nitre, sulphur, and charcoal effected a new revolution in the art of war and the history of mankind."
> (Declin & Fall, Vol V, P. 395, Everymen ed.)

George Sarton in his Introduction to Science (Vol. ii, pt. ii, pp. 1036 - 1038) has dwelt at length on the question of this invention and while discussing the three possible sources of this invention: the Chinese, the Muslims and the Latins; he has dismissed the Chinese claim as unproved, to the Latins he sees no reason to attribute this invention, while examining the Muslim source, he writes:-

> "The assumption that muslims had some knowledge of Sattpeter is corroborated by the study of the work of al-Hasan al-Rammah (second half of the thirteenth century) who described methods of purifying the substance. On the other hand there is no mention of the gunpowder in any Arabic or Persian text of the thirteenth century. They may speak of Barud, but there is nothing to show that gunpowder was meant."

One fails to understand this argument and is inclined to ask why the muslim are deprived of this revolutionizing invention when the claims of the Chinese and the Latins have been set aside? But soon after turning over one page we find the historian, after much discussion, to admit that " there is no proof that gunpowder was invented by the Chinese. It my have been invented by Muslims."

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

But again, our historian is rather confused when he finally remarks: "but there seems to be a stronger probability that the invention was made in the Latin world, that is in Western Europe."

The European historians generally attribute this invention to Berthold Schwarz. But this is also rejected by Sarton who calls this man as the legendary inventor of gunpowder (iii 2,p

1581). The French sociologist M. LeBon (تمدن عرب P.438) says that gunpowder was invented by the Arabs and adds that the guns were often used by them in defending al-Jasr in Spain when Alfonso XI laid siege to it in 1340. S. P. Scott is also of the same opinion as he writes:-

> "However, there can be no doubt that both the gunpowder and firearms were invented by the muslims, which is borne out by several European writers like Renaud, Fave, LeBon and Viardot," (اخبار الاندلس Vol. iii, p. 697)

Telescope

It is an optical insturment employed to view distant objects. The credit of this invention has been variously attributed to three indiviuals and finally Galileo is said to have invented an improved form of it in 1609. While describing the telescope, Draper thinks it needless to enter into examination of the authorship of this invention. But we have got historical data to prove that it was invented some six centuries before the time of Galileo by Ibn Al-Haitham who in his optical experiments had discovered the magnifying lenses and invented telescope of which he speaks as 'a tube to the extremities of which were attached diopters' (Spirit of Islam, P. No. 375). These 'tubes' were improved and used afterwards in the observatories of Maragha and Cairo with great success. As stated by a christian writer of Egypt, Sulaiman al-Bustani in his Dairat al-Ma'arif' Ibn al-Haitham has himself said that he is the first man to describe the magnifiying lenses. (vol, ii, p. 270).

European writers do not admit Ibn al-Haitham to be the author and originator of this invention, although they do not deny that his Optics had a profound influence in the Middle Ages on the study of Optics in Europe from Roger Bacon to Kepler. Sarton also states that " Ibn al-Haitham'a work on Optics was the main

origin of the fund of knowledge of Roger Bacon, and his theory of the combination of lenses was to lead a few centuries later to the creation of those revolutionary instruments, the microscope and telescope." This shows that Ibn al-Haitham's original works have not been properly studied and understood by these writes who deprive him of his great contribution to science. However, the German Orientalist Joseph Hell speaking of Ibn Al-Haitham's researches, remarks:-

> He was engaged in researches on spherical and parabolic mirrors, and devised a sound method of finding the focus. Roger Bacon(1294) brought home to Western scholars the results of his labours. Wrongly to Roger Bacon was ascribed what, in truth, was the distinctive achievement of Ibn al-Haitham. "(Arab Civilization, p. 94)"

Compass

Originally the word Compass is derived from Latin and ("قبّاس") is its Arabicised form, by which is meant a map showing the sea-routes as well as the longitudes and latitudes of the Oceans, islands and ports. The sailors mostly rely on this map. Ibn Fadlallah al-Umari (d. 789/1348), the well-known Egyptian historian, has discussed at lenght the history of Compass in the first chapter of the second volume of his geographical work Maslik al-Absar. This Compass or map. was used by the Roman navigators, and the sailors of the Arabian Sea and the Persian Gulf, called this map Rahnuma. The grat historian Ibn Khaldun has also described it in his Prolegomena (p. 45, Algiers). The same Latin term has been applied to the magnetic needle called by the Arabs Daira (Circle), Huqqat al-Qibla (vessel box for the Qibla), and Bait al-Ibra (box of the needle). with which we are concerned. In deciding the directiion by means of a magnetic needle, the muslims used the end which pointed to the South, as Mecca lay to the South of most places in Syria etc., the Qibla

corresponded almost exactly to the South (Ency. of Islam, iii, 105).

The oldest passage in which the word Qaramil, cor responding to Compass, occurs is found in the book al-Bayar al-Magrib of the Moroccan historian Ibn al-Idhari, for the year 239/845 and the renowned French Orientalist Reinhart Dozy has given it in the Supplement (ii, 337) of his Arabic Dictionary. Serious objections have been raised by the European scholars to interpreting the word as Compass. From the narratives of travels of the ninth century and the directions given in al-Mas'udi (923), which are in the same way as on Compass, the Orientalist G. Ferrand concludes that the compass was already in use then. The next oldest reference which is absolutely certain, is found in the Jami 'al-Hikayat of Muhammad 'Awafi (1206) in which he has described his voyage during the storm in the Red Sea or Persian Gulf, and the true course was found by means of a magnetic fish. A Turkish Author Bailak of Qibchaq in 640 A. D. (142/43 A. H.) in his Kitab al-Ahjar, has given full description of the compass and its use in the Mediterranean. An early mention of this magnetic needle is also found in the geography of al-Idrisi, the great muslim geographer of Sicily who flourished in the twelfth century. he says that this magnetic needle is also found in the geography of al-Idrisi, the great muslim geographer of Sicily who flourished in the twelfth century. He says that this compass was commonly used by the Arab navigators. The French author M. LeBon is of the opinion this magnetic needle was first introduced in Europe by the Arabs. The Europeans had never used it before the thirteenth century. George Sarton after discussing the facts representing the Chinese tradition relative to Compass, has come to the conclusion that " the Chinese were the first to perceive the directive property of the magnetic needle, but that they failed to apply it to any rational purpose. The first practical use of the magnetic needle is credited by the Chinese them-selves to for-

eigners, who were, in all probability muslim." Thus it will be seen that the Compass was a muslim invention which according to Sarton is " one of the main landmarks in the history of science.

" "From the Arabs indeed," says Joseph Hell, "the Italian navigators obtained the knowlege of the use of the Compass, without which the great sea voyage of the fifteenth century would have been an impossibility." (Arab Civilizaion, P. 88).

Influence of Europe

The muslim contributions to science exercised tremendous infuence on Europe and marked an era of scientific revival in the West: Although most of the European writers have tried to supress and hide these achievements of the muslims, yet they have been acknowleged to a considerable extent in modern times by Western scholars like M. Viardot, Sedillot, LeBon and Draper in the last century, and by present day scholars like Sarton and Briffault. I will quote here only two of them:

Draper writes:-

" I have to deplore the systematic manner in which the literature of Europe has continued to put out of sight our scientific obligation to Mohammedans. Surely they can not be much longer hidden. Injustice founded on religious rancour and national conceit cannot be perpetuated. " (ii, p. 42)

Briffault observes:-

> " What we call science arose in Europe as a result of new spirit of enquiry, of new methods of investigation, of the development of mathematics in a form unknown to the Greek. That spirit and those methods were introduced into the European world by the Arabs.

Now, gentlemen, let us ponder for a moment over the present state of our ignorance and our indifferece to scientific education, with which our ancestors were highly endowed. Admitted that among the muslims there were great scientists and inventors but are we in a postion to call ourselves rightful heirs

to their legacy? Are we entitled, in such a backward condition, to take pride in their great scientific researches, discoveries and inventions. ?

گرفتم کز حریفاں بیش یا کم می توان گفتن
ز دستت تا چہ آمد آخر این ہم می توان گفتن

Is it not therfore essential for us to learn and acquire modern science which is founded on the labours of our ancestors, and has not our Prophet said:
(Wisdom is the lost asset of the Muslim which he should pick up wherever found:) الحكمة ضالة المومن

It will not be too much to expect that as proposed by our worthy Vice-Chancellor, departments of science will be opened in this University in a near future, and along with higher studies, scientific researhes will be carried on by our scholars under the able guidance of ALLAMA Kazi Sahib, a friend, philosopher and guide, whom God has given us to lead us on the progressive path of our education.

(The "TORCH" FORTNIGHTLY)

March, 1954